 

14-11-2016

امام الصوفیاء حضرت سید علی ہجویری نوراللہ مرقدھم

مفتی منیب الرحمٰن

امام الصوفیاء حضرت ابوالحسن سید علی بن عثمان ہجویری رحمہ اللہ تعالیٰ کا سلسلۂ نسب حضرت امام حسن کے توسط سے امام الاولیاء وامیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔ آپ کا عہد مشہور روایات کے مطابق 400ھ تا 465ھ ہے، آپ کا مزار پرانوار 24 گھنٹے مرجعِ خلائق رہتا ہے۔ تصوف بنیادی طور پر صفائے قلب اور روح کی جلا کا نام ہے۔ اسے قرآن وحدیث میں تزکیہ، احسان اور عرفان سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حضرت سید علی ہجویری نے صوفیاء کی تین قسمیں بیان کی ہیں: (۱) صوفی (۲) متصوف (۳) مُسْتَصْوِف، وہ لکھتے ہیں:

(۱) صوفی وہ ہے جو اپنے وجود سے فانی ہوکر حق کے ساتھ باقی ہوگیا ہو، نفسانی خواہشات اور ان کے تصرف سے آزاد ہوکر حقیقت الحقائق یعنی اللہ عزّ وجلّ کے ساتھ واصل ہوگیا ہو۔ (۲) متصوف وہ ہے جو مجاہدے اور ریاضت کے ذریعے اِس مقام کے حصول کے لئے کوشاں ہے اور راہِ حقیقت کی تلاش میں اپنے آپ کو صوفیاء کے طریقے پر کاربند رکھتا ہے۔ (۳) مُسْتَصْوِف وہ ہے جو دنیوی منفعت کے حصول اور جاہ ومرتبے کی لالچ میں صوفیاء کی نقالی کررہا ہو، اسے نہ تو اوپر والے دونوں گروہوں سے کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ ہی اسے طریقت کے بارے میں کوئی ادنیٰ سی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ مشائخ کرام نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے: ''مُسْتَصْوِف صوفیاء کے نزدیک مکھی کی مانند ہے اور غیر صوفیاء (عوام) کے لئے بھیڑیا ہے''۔ صوفیاء کرام مُسْتَصْوِف کو مکھی سے اس لئے تشبیہ دیتے ہیں کہ یہ لوگ صوفیاء کی نقالی ہوا وہوس کی خاطر کرتے ہیں جیسے مکھی کسی چیز پر بھنکتی رہتی ہے اور عوام کے حق میں اس لئے بھیڑیے ہیں کہ بھیڑیے کا کام بھی چیرنا پھاڑنا اور مردار کھانا ہے، یعنی ناجائز طریقے، حیلے اور مکروفریب سے مفادات سمیٹنا ہے۔ الغرض صوفی صاحبِ وصول ہوتا ہے اور متصوف واصل باللہ ہوتا ہے اور مُسْتَصْوِف صاحبِ فصول یعنی ذاتِ حق تعالیٰ اور راہِ حق سے دور ہوتا ہے، وہ مزید لکھتے ہیں:

''صوفیا سے متعلق آج کل یہ مصیبت عام ہوگئی ہے، ملحدین کے ایک گروہ نے جب حقیقی صوفیا کی شان اور قدرومنزلت دیکھی، تو اپنے آپ کو بھی ان کا ہم شکل بنالیا اور کہنا شروع کردیا کہ طاعات وعبادات کی تکلیف اس وقت تک ہے، جب تک معرفت حاصل نہیں ہوجاتی۔ جب معرفت حاصل ہوگئی تو عبادات وطاعات کی تکلیف جسم سے اُٹھ جاتی ہے (یعنی انسان اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم ﷺ کے احکام اور شریعت کا مکلّف (جوابدہ) نہیں رہتا)''۔ حقیقی صوفیاء کرام کی شکل اختیار کرنے یا حلیہ بنانے یا لبادہ اوڑھنے کا تکلف بھی حضرت داتا صاحب کے عہد یعنی اسلام کی قرونِ اولیٰ اور قرونِ وُسطیٰ کی مجبوری تھی، ورنہ آج کل اس طرح کے کسی تکلف کی بھی قطعاً کوئی حاجت نہیں ہے اور نہ ہی ظاہری اعتبار سے تدیُّن اور تشرُّع کی صورت اختیار کرنے کا تکلف کیا جاتا ہے، ہر قسم کا شکار خود ہی شکاری کے جال میں پھنسنے کے لئے بے قرار ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی حقیقت کو منظوم انداز میں بیان کیا ہے۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں   کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

حضرت سید علی ہجویری نے بتایا کہ روحانی ارتقاء کی راہ میں دو چیزیں حائل ہوتی ہیں: ایک ''رَین'' اور دوسری ''غَین''۔ دراصل قلبی اور روحانی خرابیوں میں ایک تو کفر، شرک اور نفاق ہے اور اس کے سبب انسان کے دل ودماغ پر ہدایت کے انوار وتجلیات کا فیضان مستقل طور پر رک

جاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: حجاب کی دو قسمیں ہیں: ایک ''رینی'' اور یہ کبھی نہیں اٹھتا، وہ مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: بعض لوگوں کی ذات خود حق سے حجاب کا سبب ہوتی ہے، یہاں تک کہ ان کے نزدیک حق اور باطل یکساں ہو جاتا ہے۔ اسی حجاب کو ''رین'' کہتے ہیں اور اسے قرآن مجید میں ختم، طبع، اغفال، اَکِنّہ اور قساوت سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے: ''ہرگز نہیں، بلکہ ان کے کرتوتوں نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے، (المطففین: 14)''۔ یہ لوگ ناقابلِ اصلاح ہوتے ہیں اور ہدایت سے ہمیشہ محروم رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور اُنہوں (کافروں) نے کہا: جس دین کی طرف آپ ہمیں بلا رہے ہیں، اُس کی (قبولیت کی) راہ میں ہمارے دلوں پر پردے چڑھے ہوئے ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ ہے اور ہمارے اور آپ کے درمیان حجاب ہے، (حم السجدہ: 05)''۔

دوسری قسم کے حجاب کو ''غین'' کہتے ہیں۔ دراصل یہ انسان کے دل میں حرص و طمع، بُخل، ہوا و ہوس، حسد، کبر و نخوت، ریا اور دیگر اَخلاقی اَمراض ہوتے ہیں، جن کے سبب انسان کے دل پر پردہ پڑ جاتا ہے، مگر یہ حجاب عارضی ہوتا ہے اور توبہ و استغفار سے زائل ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''میرے دل پر کبھی (انوار کے غلبے سے) اَبر چھا جاتا ہے اور میں اللہ تعالیٰ سے ایک دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں، (صحیح مسلم: 42)''۔ بعض شارحین نے لکھا ہے: اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سید المرسلین ﷺ کے مقاماتِ عالیہ کے ارتقا کا سفر جاری رہتا ہے اور جب وہ اپنے اگلے مقامِ رفیع سے پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں، تو ایک غُبار سا چھا جاتا ہے اور مقامِ نبوت کے حوالے سے اسی کو ''غین'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں: ''رین'' کی مثال وطن کی سی ہے، جو مستقل ہوتا ہے اور ''غین'' سے وہ خیالات و خطرات ہیں، جو دل پر طاری ہوتے ہیں اور کبھی دل میں جگہ بھی پا لیتے ہیں، لیکن توبہ و استغفار سے ان کے اثرات مٹ جاتے ہیں۔

حدیثِ پاک میں مرتبۂ احسان کو ان کلمات میں بیان فرمایا گیا ہے: ''(احسان یہ ہے کہ) تم اللہ کی عبادت اس قدر حضوریٔ قلب (Presence of Mind) سے کرو کہ گویا تم اللہ عزّ وجلّ کو دیکھ رہے اور اگر تم (اپنی بشری نارسائی کے سبب) اسے نہیں دیکھ پاتے، تو وہ یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے، (صحیح بخاری: 50)''۔ چنانچہ حضرت سید علی ہجویری اسی مقامِ احسان کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے حاتمِ اَصم رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: آپ نماز کس طرح ادا فرماتے ہیں؟، انہوں نے جواب دیا: جب نماز کا وقت آتا ہے، تو پانی سے ظاہری وضو کرتا ہوں (یعنی اس سے اعضاءِ وضو کی پاکیزگی حاصل کرتا ہوں) اور توبہ کے ذریعے باطنی وضو کرتا ہوں، یعنی توبہ سے قلب و روح کی طہارت حاصل ہوتی ہے۔ مسجد میں نماز پڑھتے وقت خانۂ کعبہ کو اپنے سامنے، مقامِ ابراہیم کو دونوں ابروں کے درمیان، بہشت کو دائیں، دوزخ کو بائیں، پلِ صراط کو قدموں کے نیچے اور فرشتۂ موت کو اپنے پیچھے تصور کرتا ہوں۔ اس کے بعد اللہ کی عظمت و جلالت کو اپنے ظاہر و باطن پر طاری کر کے اللہ اکبر کہتا ہوں، اعزاز و وقار کے ساتھ قیام کرتا ہوں، قراءت کے وقت اللہ کی ہیبت دل پر طاری رہتی ہے، تواضع اور انکسار کے ساتھ رکوع اور اَز حد تضرُّع اور عاجزی کے ساتھ سجدہ کرتا ہوں، حلم و وقار کے ساتھ قعدہ کر کے شکر کے ساتھ سلام پھیرتا ہوں''۔

جنت کو دائیں اور دوزخ کو بائیں رکھنے کی حقیقت کو اس قول میں بیان کیا گیا ہے: ''ایمان خوف و رجا کے درمیان ہے''، یعنی حقیقتِ ایمان اور کمالِ ایمان یہ ہے کہ انسان کے دل پر خشیت و ہیبتِ الٰہی بھی طاری ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عفو و مغفرت پر اس کا یقین بھی مرتبۂ کمال پر ہو، اسی کو وعظ و تذکیر کے عنوان پر مجموعۂ احادیث میں ترغیب و ترہیب اور رغبت و رہبت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرشتۂ اَجل کو پیچھے تصور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بندۂ مومن کو ہر آن موت کے لئے تیار رہنا چاہئے اور پلِ صراط کو سامنے رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ شریعت کے جادۂ مستقیم پر ایک ایک قدم ہزار بار سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہئے، ورنہ ذرا سی بے احتیاطی اور لغزش سے انسان گہرے ظلمت کدے میں گر سکتا ہے یا جہنم کا ایندھن بن سکتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے اپنی پناہ عطا فرمائے۔

(روزنامہ دنیا، 14 نومبر 2016ء)